

توافق للبقاء

مغرب کے نظریہ ارتقاء پر ایک تعمیری تنقید

(از جناب نسیم صدیقی)

جو جو یورپ کے مذہب عقل پرستی کی "الکتاب" کا ایک شہسور سورہ "جدید نظریہ ارتقاء" ہے۔ یہ نظریہ ان بنیادی معتقدات یا اصول ہندسب میں شمار ہوتا ہے جو جو وہ سائنسی کی تشکیل کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تائید یا تردید بڑا عجیبہ معاملہ ہے۔

جدید نظریہ ارتقاء نے تنازع ببقار کے تخیل کو تمدن کی جڑوں میں پیا پیوست کر دیا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان انفرادی طبقاتی اور قومی کشمکش نہ صرف یہ کہ لازمی ہو گئی ہے بلکہ حق اور نیکی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اس تصور کا عملی اثر یہ ہے کہ زندگی ایک خوفناک جہنم کی منزل پر پہنچی ہے۔ انسان اس جہنم سے نکلنے کے لیے سخت مضطرب ہے مگر جدید انسانی شریعتوں کے معمار یہ بتاتے ہیں کہ ہم ان جہنم سے کبھی نہیں نکل سکتے، کیونکہ اس کی تشکیل ڈیکمیل ان فطری قوانین کے ماتحت ہو رہی ہے جن کے آگے سپر ڈال دینے کے ہوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ انہیں فطری قوانین کو نظریہ ارتقاء کے زیر عنوان جمع کیا گیا ہے۔

اب فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ ہمارے مذہبی سفر کے جو اصول پیش کیے جا رہے ہیں آیا وہ کسی ایسی بدیہی تحقیق پر مبنی ہیں جس کی صداقت میں شبہ نہ کیا جاسکے یا یہ تحقیقات ابھی نامکمل ہے اور ابھی ارتقاء سے حیات کے اصولوں کی دریافت میں مزید ارتقاء کی گنجائش باقی ہے۔ اگر پہلی صورت صحیح ہے تو پھر اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ "کافر تواتر شد، تا چار مسلمان شوب"۔ یعنی فطرت کے قہر و جبر کے آگے تسلیم خم کر کے اس کرہ کے اوپر ہم اپنے خون سے ہولی کھیلنے رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہم قدیم روم کے کسی خوفناک الکاٹے میں آنا رہے گئے ہیں۔ لیکن اگر دوسری صورت مقول ہو تو پھر ہمیں اطمینان کا سانس لینا چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ شاید کوئی راہ نجات نکل آئے۔ اس مضمون کا مدعا دراصل اسی امر کا تصفیہ کرنا ہے۔ ارتقاء سے حیات کے اصولوں کی نشان دہی میں مغربی مفکرین کے تدبر نے جو جو کوتاہیاں کی ہیں انہیں میں نے مختصر الفاظ میں پیش کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مردہ نظریہ ارتقاء جسے ہم نے ایک تجربی صداقت کی حیثیت دے کر اپنے علوم کی روح بنا دیا ہے، وہ حقیقت ایک تجربی صداقت نہیں ہے۔

طبیبیاتی نظریہ | یہ حقیقت کہ کائنات کی حیثیت مجموعی اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ اپنی موجودہ شکل تک تدریج کے راستہ سے پہنچی ہے ایک ایسی حقیقت ہے جو سمری مشاہدہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ باقول نظر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کائنات چھلانگیں نہیں لگاتی بلکہ اپنے فطری راستہ پر ایک خاص رفتار سے ریگڑ ہی ہے، اس حقیقت کو علت معلول اور سبب مسبب کے پیچیدہ نظم سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں دانہ ٹٹی میں ملتا ہے، پھر اس پر زمین قوتیں متواتر اپنا عمل کرتی ہیں، پھر زمین سے ایک کوئل سی ابھرتی ہے، پھر حرارت، ہوا

روشنی اور پانی کے مجموعی عمل سے یہ تناور درخت بننے لگ جاتی ہے۔ پھر اس پر بوراتی ہے، پھر پھول گتے ہیں، پھر پھول کی زیریں ٹھلی میں حمل قرار پاتا ہے، پھر ننھا سا بچہ پھول کی ٹھلی میں جاتا ہے۔ یہاں اگر بارش برتی ہے تو اس کے پیچھے اسباب و علل اور وسیع سلسلہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ سورج اپنی گرمی سے پانی کو بخارات میں بدلتا ہے، بخارات حرارت کی مدد سے کشش زمین کے خلاف حرکت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، پھر یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر دو دروازہ علاقوں میں جا پہنچتے ہیں، پھر کسی ٹھنڈی فضا میں عمل نکالتے اور قح ہوتا ہے اور ننھی ننھی بوندیاں ٹپکنے لگتی ہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ کہہ دیتے ہیں کہ بارش ہو رہی ہے۔

اس سلسلہ اسباب و علل کو اگر اور قریب دیکھنا ہو تو انسان کی حیات جسمانی کا مطالعہ کیجیے۔ کس طرح قوت میں، انحطاط آتا ہے تو بھوک لگتی ہے، پھر کس طرح غذا کو جذب و بدن بنانے کے لیے ایک پوری مشین اپنی پیچیدہ فعالیت کو استعمال کرتی ہے، پھر کس طرح از سر نو قوت پیدا ہو کر اعمال کی تشکیل میں صرف ہونے لگتی ہے جسم کے نشوونما کو دیکھیے، اس کی صحت کے بگڑنے اور بحال ہونے کے اصولوں کا مطالعہ کیجیے اور اس پر بڑھا پائے اور موت کے اثرات پر غور کیجیے تو آپ ایسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہر تغیر اپنے پیچھے اسباب رکھتا ہے اور اسباب کا ظہور بالکل منطوق سے ہوتا ہے۔

سلسلہ اسباب و علل کے جاری رہنے کے لیے تدریج ناگزیر ہے۔ چنانچہ آپ کائنات کے ہر تغیر اور تعمیری عمل میں تدریج کو کار فرما دیکھتے ہیں۔ وقت بالکل اسی طرح گزر رہا ہے جس طرح قدیم عہد کی آبی گھڑیوں میں پانی کی ایک ایک بوند پختی رہتی تھی، جتنی کہ اوپر کے خانے کا پورا پانی نچلے خانے میں آ جاتا۔ لمحہ لمحہ کر کے ساعت بنتی ہے، ساعتیں گذرتی ہیں اور پہر بنتے ہیں۔ اسی طرح دن، ہفتے، مہینے، سال، قرن، صدیاں اور دور ایک خاص رفتار سے بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر یہاں تدریج کا قانون برسر عمل نہ ہوتا اور فطرت حیرت انگیزی ہوتی تو کائنات کی پوری داستان دو چار لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ یعنی مادہ عدم سے ایک دم وجود کی انتہائی شکل میں منتقل ہو جاتا اور اسی طرح وجود سے عدم میں اس کا انتقال بھی آتی ہوتا۔ لیکن داستان وجود ہیبت طویل ہے۔ اتنی طویل کہ ہم اس کے آغاز کا دھندلا سا تصور ہی کر سکتے ہیں۔ یہ طویل حکایت تدریج سے پیدا ہوا ہے۔

اب دوسرا مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کائنات کی تدریجی حرکت ارتقائی ہے یا انحطاطی؟ سوائے سلسلہ میں مختصراً علوم طبیعیہ نے جتنا مواد فراہم کیا ہے وہ یہی شہادت دیتا ہے کہ یہ حیثیت مجموعی کا رخا نہ وجود میں بناؤ کے آثار پائے جاتے ہیں اور موجودات کمال کی طرف گامزن ہیں۔ مذہب کی شہادت بھی یہی بتاتی ہے کہ پہلے کچھ نہ تھا، پھر دنیا کی تعمیر شروع ہوئی اور اسی دنیا کا ایک حصہ کرہ ارضی بھی تھا، پھر اس کرہ ارضی میں زندگی نمودار ہوئی اور آخر کار زندگی کا کمال ترین نمونہ انسان عاقل بنا گیا۔ وجود کی رونق بنا۔ جو لوگ خدا کو کا رخا نہ فطرت کا موجود اور مدبر مانتے ہیں ان کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کی قدرت کا آرٹ ایک خاص منزل پر رکھا ہوا ہے یا وہ رد بانحطاط ہے۔ ایک حکیم ہستی پر ایسا الزام لگانا ان کی فطرت سے بہت بعید ہے۔ میں قرآن خود بتاتا ہے کہ صرف زمینوں اور آسمانوں کے خاندان کی تخلیق ستے ایام میں ہوئی ہے۔ (یہاں "یوم" سے مراد دور ہے۔) اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد زندگی کا جو کھیل رچا گیا ہے اس پر کتنے اطوار گذرے ہوں گے۔ یہ اطوار راہ منزل کے سنگ ہائے میل تو نہیں ہو سکتے، یہ ارتقائی کے مرحلے ہیں۔

بہر حال یہ حقیقت کہ کائنات متجدد نہیں بلکہ متحرک ہے اور اس کی حرکت انحطاطی نہیں بلکہ ارتقائی ہے، اسے یورپ کے

طبیعیات، ماہرین طبقات لاریض اور علماء سے حیاتیات نے ناقابل انکار پایا اور اسے اپنی فکری کاوشوں کے مساویات میں داخل کر لیا۔ لیکن اس میدان میں ان کی خوفناک ذہنی لغزش یہ تھی کہ عیسائیت کی ناروا بندشوں اور ارباب کلیسا کی حرکتوں نے ان میں خدا پرستی کے خلاف ایک مقصد نہ پیدا کر دیا اور اسی باغیانہ انتہا پسندی کے ماتحت انہوں نے کائنات کے کارخانے کو بے خدا چلتا ہوا دکھانے کی کوشش کی۔ جوں جوں ان پر کائنات کی اس تدریجی حرکت کا انکشاف ہوتا گیا جو علت و معلول کی شاہ راہ پر اصول فطرت کی حدود کے متعلق جاری ہے، وہ خدا کی نئی پر مائل ہوتے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بارش برساتنے کے لیے اداۃ آگاہی کے لیے، زندگی کو نمود عطا کرنے کے لیے کائنات کی قوتیں بالکل کافی ہیں اور ہر شے کو اس کا طبعی سبب کسی فوق الطبعی خارجی قوت کی مخالفت کے بغیر نمود دے رہا ہے۔ ان کے طبعی فلسفہ کا فتویٰ یہ تھا کہ مادہ اور قوت کا باہمی تعامل صرف وہی شکل اختیار کرتا ہے جو صحیح اور موزوں ہوتی ہے۔ یہی کائنات کی قانونیت کا راز ہے۔

انہیں رکھنے والا اگر نہ دیکھنا چاہے تو اسے سوچ بھی دکھائی نہ دے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا۔ ورنہ کائنات میں قوت کا ہونا، قوت اور مادہ کی مشین کے پیچھے ایک ہمہ گیر شعور و ارادہ کی کارفرمائی کو لازمی کر دیتا ہے۔ پھر ارتقائی حرکت تو شعوریت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وہ تو ایک ایسا ذہن چاہتی ہے جو ارتقائی اور انحطاطی حرکت میں تیز کر سکے اور جو ترقی کی مترین مطلوب اپنے سامنے رکھتا ہو۔ یہ نصب العین اور قوت دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں۔ ایک مشین جسے وجود میں لانے کے لیے مادی سامان (Material) کی اور جسے حرکت میں لانے کے لیے قوت (Energy) کی ضرورت ہے، اپنی ترتیب اور اپنی منظم حرکت کی نتیجہ خیزی کے لیے لامحالہ ایک شعور کی محتاج بھی ہے۔ پہلی دو ضرورتوں کو تو مغربی سائنس نے تسلیم کیا لیکن تیسری ضرورت سے بہت بری طرح چشم پوشی کر لی۔ یہ غلطی طبیعیات کے میدان میں ایک عمومی سی لغزش نظر آتی ہے مگر چونکہ اس کا دائرہ اثر انسان کی تہذیبی زندگی کو محیط ہوتا ہے اس لیے پھر اس سے غلطیوں کی ایک نسل چل نکلتی ہے۔

حیاتی نظریہ | مدتوں پہلے عربی حکمران بنات لور پرندوں کے مطالعہ سے یہ راہ منکشف کر چکے تھے کہ نباتی اور حیوانی زندگی میں ارتقاء کا راز ماہرین بنات لور کی کمی کی وجہ سے وہ ایک مکمل علم کی حد تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس عظیم انسان کا نامہ کاہرا ڈارون کے سر بن رہا۔ اس نے نباتات، کیڑوں، کوڑوں، دریا پائی جانوروں، تیبیسوں اور دوسرے پرندوں کے مطالعہ و مشاہدہ سے حیوانی ارتقاء کے تصور کو مکمل کیا۔ اور ان حوالہ کی نشان دہی کی ایک ابتدائی کوشش کی جن کے ماتحت یہ ارتقاء واقع ہو رہا ہے۔ جہاں تک نفس ارتقاء کے دعویٰ کا تعلق ہے، ڈارون سے اختلاف کرنا مشکل ہے، لیکن اس نے اپنے نظریہ کی جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ پوری کی پوری قابل قبول نہیں ہیں۔ اولادہ نباتاتی زندگی کی طرح حیوانی زندگی کے ایک ہی نقطہ آغاز "امیبا" کا قال ہے۔ اسی خیال کی تشریح اس نے اصل الا نوریع میں کی ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ علم الحیات کا خاکہ تو بنا ہے مشاہدہ سے مگر اس کو مکمل کرنے کے لیے رنگ آمیزی کی گئی ہے قیاس سے۔ مشاہدہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ تو ناقابل انکار ہے مگر قیاس کی ستم ظہینیاں چون و چرا کی کافی گنجائش اپنے اندر رکھتی ہیں۔ یہ دعویٰ محض قیاسی ہے کہ زندگی نے واحد نقطہ آغاز سے حرکت شروع کی تھی۔ آخر یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ زندگی کی اولین نمود کے لیے کرہ ارضی پر صرف ایک ہی مقام پر حالات سازگار ہوئے تھے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اسے مختلف مقامات پر شروع ہونا چاہیے۔ اس صورت میں اس کے ابتدائی نمود کی شکل کو ہر ماحول میں ایک ہی ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود ڈارون اور اس کے متبعین اختلاف ماحول کو حیاتی و عضو یاتی اختلافات

کا ایک نہایت قوی سبب مانتے ہیں۔ پھر اگر مختلف حالات اور مقامات سے مختلف پیرایوں میں زندگی کے ظہور کو مان لیا جائے، تو اصل انواع کا سارا فلسفہ باطل ہو جاتا ہے۔

پھر حیات کی حرکت کو جاری رکھنے والے معدود اصول بقائے صلیح (Survival of the Fittest) کی تشریح پیش کی گئی ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی اپنی ادنیٰ اشکال کو کھپتی اور زندگی ہوتی کسی عالی شکل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس موقع پر دو مشہور سوال پیدا ہوتا ہے جسے حایمان ارتقار کی تکمیل نہیں کر سکتے ہیں کہ زندگی کی بعض بالکل ابتدائی اشکال توحید ٹمڈ کیوں کر وہ ارضی پر پاتی ہیں، مثلاً ٹھیلیاں، مینڈک وغیرہ جی کہ زندگی کا پہلا ڈیزائن یعنی "امیسا" بھی نہیں برٹ سکا۔ زندگی نے جب انسان جیسا اعلیٰ مظہر فراہم کر لیا ہے تو اس کے ساتھ یہ ادنیٰ حیوانات کیوں بچے جا رہے ہیں؟ اس کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو ادنیٰ حیوانات ابھی تک بچے جا رہے ہیں انھوں نے ماحول کے ساتھ موافقت پیدا کر لی ہے۔ مگر اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو حیوانات دینا سے ناپید ہو گئے ہیں وہ کیوں نہ ماحول سے موافقت پیدا کر سکے؟ آخر ماحول سے موافقت پیدا کرنے یا نہ کرنے کی ذمہ داری براہ راست جو دہر تو ہے نہیں، اس کا انحصار تو بہر حال فطرت پر ہے، تو براہ کرم یہ بتائیے کہ کون سا قانون تھا جس کے ماتحت مینڈک سلامت رہا اور سیرخ ناپید ہو گیا؟ اس کی جسامت کن اسباب کے ماتحت کم نہ ہو سکی؟ اس کا معدود کن اصولوں کے زیر اثر نہ ہو سکا؟ وہ دشمن سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بہتر اعضا کیوں فراہم نہ کر سکا؟

اور آگے چلے، حیات کا لائق عمل جن اصولوں پر واقع ہوتا ہے وہ جنوں کے توں ہیں اور حیات کی بالکل ابتدائی اشکال بھی موجود ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ارتقار کی راہ پر ایک ہی قافلہ انسانیت کی منزل تک پہنچ کر رہ گیا، اس کے بعد کوئی دوسرا قافلہ آگے نہ بڑھا؟ حالانکہ قانون ارتقار کی رو سے تو بتویہ چاہیے تھا کہ پہلے قافلہ کے بعد بے شمار قافلے حیوانیہ سنٹ کی سرحد سے انسانیت کے حدود میں پہنچنے والے داخل ہوتے چلے جاتے اور شاہ راہ ارتقار کی ہر منزل پر ہم ایک نہ ایک قافلے کو بالفضل موجود پاتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اول تو بیچ کی منزلوں پر بکثرت کڑیاں غائب ہیں جن کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی، دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے پانچ ہزار برس کے دوران میں جس کا نادہنی دائری ریکارڈ محفوظ ہے، انسان صرف انسانی نطفہ ہی سے پیدا ہوتے رہے ہیں، نچلے طبقاتی حیوانوں میں سے کوئی بھرتی نوع انسانی کو نہیں ملی۔

یہ ایک نہایت قوی اعتراض ہے جس کا کوئی معقول جواب ڈاروینی نظریہ کے پیرو نہیں دے سکے ہیں۔ بسا اوقات وہ کہتے ہیں کہ ارتقار کی راہ پر یکے بعد دیگرے قافلے چلے آ رہے ہیں، یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا ہے، اور اس کے ثبوت میں "بن مانس" پیش کیے جاتے ہیں کہ یہ ہمارے پچھلے ایک قریب ترین قافلہ ہے جو منزل کے نزدیک پہنچا ہے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو پھر گمشدہ کڑیوں کا مطلب کیا قرار پائے گا؟ عقیدہ ارتقار کا کوئی علمبردار بھی اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ زندگی کی تمام اشکال ۲ سے ہی تک موجود ہیں۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ سلسلہ وجود کی بعض کڑیاں ناپید ہیں اور اس سے ان کے نظریہ پر جو نقص وارد ہوتا ہے اسے دغ کرنے کے لیے وہ فرض کر لیتے ہیں کہ حیات کی فلاں فلاں قسم کی فلاں فلاں صفات رکھنے والی بعض اشکال "تسا زرع البقاہ" کے سوسے میں شہید ہو گئی ہیں، یعنی اگرچہ وہ آج موجود نہیں ہیں، مگر وہ کبھی نہ کبھی تھیں ضرور! ان کے اس بیان کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم انسان ارتقار کی جو راہ طے کر کے موجودہ منزل تک پہنچے ہیں اس لئے ان کے اس قول کو ہم مفروضہ سے اس لیے تعبیر کرتے ہیں کہ انھوں نے آج تک اس بات کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ جن کڑیوں کو (باقی)

میں جا بجا بڑے بڑے غار پڑ گئے ہیں اور گشدرہ کڑیوں نے اس تسلسل کا خاتمہ کر دیا ہے جو حیات کے ارتقائی سفر میں ہونا چاہیے تھا۔ پھر کوئی قافلہ اس تباہ شدہ راستے پر کیسے بڑھ سکتا ہے؟

اب اگر مزید قافلوں کی روار و مسدود ہے تو لازماً اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان تک پہنچنے کے بعد زندگی کی ارتقائی حرکت بند ہو چکی ہے۔ اور جب عمل ارتقار جاری نہیں ہے تو تنازع البقار کے کیا معنی؟ اور بعض بہت ترقی یافتہ شکلوں کے مفقود ہونے کے بعد بعض دینی اشکال حیات کے باقی رہ جانے کی کیا وجہ؟

ادپر کی سطور سے غالباً یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ڈارون کا نظریہ مشاہدات اور قیاسات کا غلط ہے لہذا اس کی حیثیت ایک تجربی صدقہ یا ایک ثابت شدہ حقیقت کی نہیں ہے۔ مگر اس کو جب فروغ حاصل ہوا تو علمائے یورپ نے اسے ایک اہم واقعی کی طرح ناقابل تردید مان کر اس کی بنیاد پر علوم کی تمدن شروع کر دی۔ پھر ان علوم پر نظام زندگی کی جو عمارت کھڑی کی گئی وہ انسانیت کی آسائش گاہ بننے کے بجائے آدم کشی کے لیے ایک چھاقتل ثابت ہوئی۔

جس طرح علمائے طبیعیات نے خدا کے انکار کو فکر کا نقطہ آغاز بنایا اسی طرح ڈارون اور اس کے متبعین نے حیاتیات کے کلیسا کو خدا سے خالی کر کے فلسفہ حیات کی تعمیر شروع کی، حالانکہ اس غلط طرز فکر سے بعض ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں جن کا سلجھانا کار سے دارو ہے۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ طبیعی عناصر کے اندر مقام شعور کی طوت بڑھنے کا رجحان کہاں سے آیا اور اس کے لیے ایک ایسی شاہ راہ کے مراحل کس نے تجویز کیے جو طے کیے جانے سے پہلے موجود نہیں تھی؟ "اصلیت" کا معیار کس کے پاس تھا جو اعلیٰ کو ادنیٰ سے چھانٹتا جا رہا تھا؟ ایک حیوان نے ماحول کے تقاضوں سے جب دوچار ہوتا تھا تو کون تھا جو اس میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس کرتا تھا اور کون تھا جو اس ضرورت کو پورا کرتا تھا؟ اور کس نے ارتقار کے لیے تنازع البقار کا قانون بنایا جس پر جانداروں کی نسلیں بھینٹ چڑھ گئیں؟ — "کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں"۔ مگر اس معشوق کا انکار کر کے یورپ کی حکمت اس پردہ زنگاری ہی کو معشوق بنا بیٹھی۔

اس نظریہ کا نمایاں ترین اثر انسانی ذہنیت پر یہ پڑا کہ انسان کو انسان سمجھ کر خود کرنے کے بجائے اسے حیوان فرض کر کے مختلف سیاسی، معاشی اور اخلاقی سوال حل کرنے شروع کر دیے گئے جہاں کوئی پیچیدگی تمدن میں پیدا ہوئی ماہرین فنون نے پلٹ کر انسان کے نو دریافت شدہ "اسلاف" کی زندگی کا مطالعہ شروع کر دیا اور جو اصول حیوانی زندگی میں کار فرما دیکھے انھیں جوں کا توں لا کر انسانی زندگی پر چسپاں کر دیا۔ اس طرح ہوتے ہوئے "تہذیبی ارتقار" کا ایک عظیم اٹان فلسفہ مدون ہوا جس کے اصول نئی انسانی دنیا کے سیاسی معتقدات میں شمار ہوتے ہیں اور جن کے اثبات میں انتہائی تصعب کا کام لیا جاتا ہے۔

تہذیبی نظریہ اور اس کا ارتقار | یورپ میں جاگیر داری نظام کی جاغیشنی کے لیے جس دن شیشی رور نے جنم لیا تھا، شاید دنیا کے لیے اس سے بڑا انحوس دن کوئی نہ آیا ہو گا۔ اسی دور میں سائنس نے انسان کو نوبتو قومیں سو کر دیں اور تین نام کے آہنی دیو کو تہذیب انسانی کے قہر زبریں میں تخت استبداد پر بٹھا دیا۔ تینوں جو خدا کا ایک عظیم اٹان انعام تھی، اس کی سرعبت عمل اور کثرت

(بقیہ) وہ مفقود قرار دیتے ہیں وہ فی الواقع کبھی پائی جاتی تھیں، بلکہ دراصل اپنے نظریہ کو سائنٹفک حیثیت قائم کرنے کے لیے انھوں نے فرض کر لیا ہے کہ یہ کڑیاں کبھی ضرور پائی جاتی ہوں گی۔

کارگزار می مزب کے حفظ نظام کی وجہ سے انسانی تمدن کے لیے ایک عذاب بن کر رہ گئی۔ اس کا پہلا حملہ دستی صنایع پر ہوا کیونکہ مشین سے کام لینے کے لیے سرمایہ دار کار تھا اور اس سے کارگر محروم تھا۔ وہ بجا عقل کا پورا "مگر گاتھ کا کورا" تھا۔ مشین صرف مزید دار کے جوارہ عقد میں آ سکتی تھی چنانچہ اپنے طبقے کے لوگوں نے کارخانے کھول لیے اور صنایع ان کے پاس مزدور بن کر کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی مجبوری کی وجہ یہ تھی کہ مشینی مصنوعات پر وقت اور انسانی قوت کا صرفہ بقا بلکہ دستی مصنوعات کے بہت ہی کم آتا تھا اور اسی وجہ سے ان کی قیمتیں بہت کم ہوتی تھیں۔ جوں جوں مشینیں بڑھتی گئی صنایع طبقہ کارخانوں میں جمع ہوتا گیا۔ ان کی مجبوری سے فائدہ یوں اٹھایا گیا کہ مشینی کثیر پیداوری سے جو غیر معمولی منفعت ہوتی تھی وہ تو سرمایہ دار کی تجوری کا پیٹ بھرنے کے لیے وقف ہو گئی اور کارکنوں کو صرف اتنا معاوضہ دینا کافی سمجھا گیا جس کے بل پر وہ کسی طرح جیے جائیں اور صنعت گے کو لھو "کو چلاتے رہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کے معاوضے بہت قلیل رکھے گئے بلکہ ان کے اوقات کار کو بڑھانے میں بھی کوئی دقیقہ فرگذاشت نہ کیا گیا۔ نوبت یاس جارجسڈ کہ ایک خاندان کے پورے افراد کا نے پر مجبور ہو گئے، حتیٰ کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے نکلنا پڑا اور نابالغ بچوں کو بھی کارخانہ داروں کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ پیٹ پانا ہی کیا کم شکل تھا کہ کارخانوں کی کیمیاوی فضا اور کثرت کار اور عالم طفلی کی محنت نے انہیں کر مزدور طبقہ کی صفوں کو انتہائی طور پر گرا دیا۔ ہوتے ہوتے سوسائٹی مستقلاً معاشی نقطہ نظر سے ظالم و مظلوم اور طبقوں میں بٹ گئی۔

سوال یہ ہے کہ یہ حالت پیدا کیسے ہو گئی تھی؟ کیوں نہ طبقہ دارانہ مظالم کی بروقت روک تھام کی گئی؟ اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ مشینی دور جو ہریت کو بھی ساتھ لایا تھا جس نے سرمایہ دار طبقہ کو حکومت کی مشینری پر پورا قبضہ سے دیا تھا اور یہ قبضہ کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ لیٹرے خود ہی حاکم بھی تھے اور نئے دے انہی کے آگے فریاد کرنے پر مجبور تھے۔ یہ فرماں رواج قانون بناتے تھے اس کا مقصد لوٹ کھسوٹ میں مزید سہولتیں پیدا کرنا اور کمزوروں کا خون چوسنے کے حق کی حفاظت کرنا تھا۔ انہیں نئے دلوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ہمدردی اور انسانی ذمہ داریوں کے احساس کا ایک محرک مذہب ہو سکتا تھا، سوائے پادری پہلے ہی دیا بر دیکھتے تھے اور اس کے رہے سب سے اقتدار کو جدید سائنسٹک تحریک نے بالکل ختم کر دیا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ جاگیر داری نظام کو ختم کرنے کے لیے جس انفرادی آزادی کا صورتاً ٹھکانہ صدی میں پھونکا گیا تھا اس نے ہرزہ کو کھلا لائسنس دے دیا تھا کہ اپنی قابلیت، ہوشیاری اور ذرائع و وسائل سے جس طرح چاہے اپنے مفاد کو ترقی دے اور اپنے حوصلے اور اپنی خواہشات پوری کرے قطع نظر اس سے کہ سوسائٹی پر اس کی خود غرضی کا کیا اثر مترتب ہو۔ معیشت، معاشرت، تمدن، اخلاق، غرض ہر شعبہ زندگی میں اس آزادی کو فرد کا بنیادی حق قرار دے دیا گیا اور تمام قوانین اس اصول پر بنائے گئے کہ افراد کے اس حق کی لازماً حفاظت کی جائے۔

مشین اور سرمایہ داری کے اس گٹھ بندھن کا نتیجہ صرف یہی نہ نکلا کہ مغربی ممالک میں سے ہر ملک کا مال دار طبقہ خود اپنے ملک کے غریب طبقوں کے لیے خوں آشام بن گیا، بلکہ مزید برآں اسی چیز نے جدید امپیریالزم کو بھی جنم دیا۔ مشین کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کم آدمیوں کی محنت سے بہت مال پیدا کرتی ہے اور ملک کے کثیر التعداد باشندوں کو بے کار کر دیتی ہے۔ اب اگر ایک ملک جو مشینی صنعت کا طریقہ اختیار کر چکا ہو، اپنے تمام باشندوں کو برسر کار رکھے تو وہ اتنا زیادہ مال بنائے گا جو کسی طرح خود اس ملک میں نہیں کھپ سکتا۔ لہذا اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ دوسرے ملکوں میں اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیاں پیدا کرے اور اس کے ساتھ اس امر کی کوشش

بھی کرے کہ نہ تو خود ان ملکوں میں مشینی صنعت کا طریقہ رائج ہونے پائے اور نہ وہاں کسی دوسرے ملک کا مال کھپ سکے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف پوری دنیا ظالم ملکوں اور مظلوم ملکوں میں تقسیم ہو گئی اور دوسری طرف خود ظالم ملکوں میں بھی دائمی رقابت اور جنگ کی بنا پر لگتی۔

مگر اس کشمکش اور اس معاشی لوٹ کا فائدہ جو کچھ بھی ہوا ظالم ملکوں کے محض سرمایہ دار طبقوں ہی کو ہوا، نادار طبقوں کے لیے اس میں کوئی فائدہ نہ تھا، بلکہ ان کی ناداری اور بڑھتی چلی گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کا اقتضا ہی یہی ہے کہ خوب غریب تر اور میسر تر بنا کر پھینکا جائے۔ اس عمل کا سلسلہ جب تک عرصہ تک جاری رہا تو طبقاتی ناہمواری ناقابل برداشت سی ہو گئی۔ اب عیاشی اور فائدہ کشی کا بڑھتا ہوا فرق کھلنے لگا۔ اسی دوران میں عداوت و دشمنی سے نتائج اخذ کرنے کا فن پھیل رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے طبقہ دارانہ شرح اموات اور شرح بیماری کو نمایاں کیا، جرائم کی تحقیقات کرنے والی کمیٹیوں نے عدالتوں کے ریکارڈ سے جرائم کی رفتار اور اس کے معاشی محرکات کو جان کر لیا، آخر کار علماء کی توجہ اس طرف منتقل ہوئی کہ یہ خلافتِ ناسیبت حالات کیوں پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن مسئلہ جتنا افسوس ناک تھا اس سے زیادہ افسوس ناک وہ عمل نکلا جو مغربی ذہن نے تلاش کیا۔ یہی وہی صاف بات تھی کہ دنیا اور اس کی متاعات کو لا وارث مال سمجھنے اور معیشت کو انفرادی معاملہ قرار دے کر آدمی کو کما لے اور کھانے میں بے لگام بنا دینے کا لازمہ یہ تھا کہ انسان انتہا درجہ کی خود غرضی سے کام لے اور اپنی زندگی کو ایک طبعی حادثہ سمجھتے ہوئے کسی اونچے مقصد سے بے نیاز ہو کر زیادہ سے زیادہ لذت و لطف حاصل کرنے میں لگ جائے، خواہ اس لطفِ لذت کی قیمت میں اسے اپنے اپنائے نوع کا خون ہی کیوں نہ دینا پڑے، جب خدا شناسی نے اسے اخلاقی ہستی سے گر کر محض ایک معاشی جانور بنا دیا تھا تو پھر وہ اپنے پیٹ اور اپنے جھانڈے جینی کے مقابلہ میں اپنائے نوع کا کیا پاس کر سکتا تھا۔ مگر اس یہی وہی صاف بات کو علماء مغرب نے پاس کیا۔

عضویاتی زندگی نظریہ ارتقار کی لپیٹ میں پہلے ہی آچکی تھی۔ اس کے ساتھ تمام مسائل زندگی کو ایک ہی اصول سے حل کرنے کا رجحان بھی بڑھ رہا تھا۔ بس علماء عمرانیات نے اپنے عقلی تمدن کے حق میں پوری فریگی کے ساتھ یہ فتویٰ دے دیا کہ سوسائٹی میں انہیں فطری اصولوں پر ارتقا کر رہی ہے جو عضویاتی زندگی میں کام کر رہے ہیں۔ یہاں بھی تنازع لبقا کا قانون اسی طرح برسر عمل ہے جیسے بے جان مادہ سے لے کر حیوانات تک میں پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی زندگی ناقص اور کمزور افراد، طبقات اور اقوام کو پیچھے چھینکتی اور قوی و صالح افراد، طبقات اور اقوام کو آگے بڑھاتی جا رہی ہے اور یہی ارتقار کی شاہ راہ ہے۔

خدا شناسی کے فطری نتیجہ کے طور پر جو غیر فطری حالت پیدا ہو گئی تھی اسے ان لوگوں نے فطری قرار دے کر اتنا بڑا ظلم کیا کہ اس پر ان سینت صدیوں تک ماتم کرتی رہے گی۔ دنیا بھر میں سرمایہ دار طبقہ اور امپیریٹل اقوام کو تو اصلیت کی سند دے کر فریڈ تم ڈھانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور مزدور طبقہ اور محکوم اقوام کو یہ سبق پڑھایا کہ یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو گئے ہو بالکل فطری ہے۔ تم اگر پس رہے ہو تو تمہارا حق یہی تھا کہ پسو۔ انسان اپنے اپنائے نوع سے مستقلاً برسرِ جنگ رہنے پر مجبور ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کیا وہ ظالم طبقہ میں شامل ہو یا مظلوم گروہ میں۔ ان دو حالتوں کے سوا کوئی تیسری فطری حالت ممکن ہی نہیں ہے۔ فرد بہر حال افراد سے، خاندان خاندانوں سے، پارٹی پارٹیوں سے اور قوم قوموں سے اضطراباً منقادوم ہے اور اس نقیضہ میں کمزور کا مسٹ جانا ہی ارتقا حیات کا مقتضا ہے۔ اندھی مشیت کی یہ حیرت انگیز مثال ہے اور اس کا مقابلہ ناممکن!

یہ تکمیل ایسا تھا کہ اس نے میدان میں آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے تو ان تمام لوگوں کی زبانیں بند کر دیں جو تمدن جدید کی ناہمواریوں پر مجرب بڑا رہے تھے۔ یہ جو احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ ہم نے زندگی کے نظام کی ترتیب و تنصیب میں کوئی غلطی کر دی ہے ایک طویل عرصے میں خودکشی کر گیا۔ طبقاتی اور قومی اپیئر یلزم نے اس نظریہ کا سب سے پہلے خیر مقدم کیا کیونکہ یہ ان کی معاشی و سیاسی جلاوی کو فطری نیکی قرار دے رہا تھا۔

انگلا قدم | یہاں تک کی مٹی کا دشوں نے محکوم اقوام اور مزدور طبقہ دونوں کو فطرت کی جبریت کے پنجہ میں بے بس چھوڑ دیا تھا، لیکن بعد کے علماء نے ایک قدم آگے بڑھا کر مزدور طبقہ کو ایک نئی راہ نجات دکھائی اور وہ یہ تھی کہ تم قوت پیدا کر کے بقائے اصلح کے قانون کا تقاضا پورا کر دو تو اس آسمان کے نیچے تمہیں بھی کبریائی کا منصب مل سکتا ہے۔ سوسائٹی خاندان نہیں ہے کہ اس کے افراد آپس میں تعاون کے ساتھ جیں بلکہ یہ پیدائشی دشمنوں کا ایک مجمع ہے جس کے اجزائے ترکیبی کے لیے قانون فطرت یہی ہے کہ ہر ایک دوسروں کو بھون کر کھانے کے لیے کوشاں رہے۔ یہاں شریف بن کر رہو گے تو گھائے میں رہو گے اور اگر شرافت انسانی کی بقا آنا کر نزع و مقابلہ میں مشغول ہو جاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تاریخ کا جدلی فلسفہ مرتب ہوا۔ جدل و پیکل ارتقاء کی شاہ راہ ٹھیری اور ہر بڑی قوم ریزی زندگی کے رہوار کے لیے ایک تازیا نہ قرار پائی۔

اب نئے فلسفہ اخلاق نے یہ اپدیش دینا شروع کیا کہ لذت اندوزی سب سے بڑی نیکی ہے اور سوسائٹی کی خاطر اپنی خواہشات پر کوئی روک لگانا ایک ایسا گناہ ہے جس کی تلافی کبھی ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ زندگی اسی کوہ پر ختم ہو جانے والی ہے۔ ریاست کا مذہب یہ قرار پایا کہ حکومت پر جو گروہ قابض ہو جائے وہ اپنی اصلیت کی وجہ سے بجا طور پر اس کا سختی ہے کہ قانون کے رولر سے ان لوں کو کھلتا پھرتے۔ نیم ہندب اور نئے اٹھ سے محروم اقوام بدترقی یافتہ اقوام کا اپنی خدائی مسلط کرنا ان کا فطری حق ہے۔ معاہدات کے فلسفہ کی پکار یہ تھی کہ دینا ابک ایس خوان نعمت ہے جو محض خوش اتفاقی سے انان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ اس کی نعمتوں سے حصہ وافر پانے کے لیے جہاں تک ممکن ہو دست درازی سے کام لیا جائے۔ کسی کا حصہ مقرر نہیں ہے اور کسی کے لیے حصہ کی تحدید نہیں ہے۔ اس دسترخوان کے استعمال کا کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں ہے۔ مزے سے اپنے سامنے کی کشتی سے بھی تر مال اڑاؤ اور ہوس کے تو دوسروں کی دکایوں کو بھی چپٹ کر جاؤ بلکہ اگر کسی کے منہ سے نوازہ پھین لو تو یہ بہت بڑی اصلیت ہے اور اگر پیٹ میں نقب لگا کر معدہ سے غذا چرالاؤ تو پھر تو کمال صلاحیت کے کہنے ہی کیا ہیں اور اگر بنا بنا یا خون جو س سکو تو انسانیت بھاری "ز لوظونی" پر قرون فر کرتی رہے گی۔

یہ نظریات تھے جنہوں نے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو جہنم زار بنا دیا اور جدلی فلسفہ تاریخ کے ماتحت اسی نظام کے پیٹ سے وہ نظام برآمد ہوا جسے آج کیونزم کے نام سے برتعلیم یافتہ شخص پہچانتا ہے اور جس نے سرمایہ داری کی قبرمائیوں کا جواب مزدور کی خونیں و کھیر سے دے کر نظریہ ارتقار کے صداقت نامہ پر جہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

تھریہ کہ اس سماجی نظریہ ارتقار نے حسب ذیل اصول پیش کیے ہیں :-

(۱) جو قانون ارتقار بے جان مادے کی حرکت میں پایا جاتا ہے اور جو عالم حیوانات میں اور خود ان کی عضو یاتی زندگی میں

جاری ہے وہی تمدن کی حرکت میں بھی کار فرما ہے۔

(۲) تمدنی ارتقار غیر منقطع تسلسل کے ساتھ اور انسانی شعوری خواہش کے بغیر ہوتا ہے۔

(۳۳) اس ارتقار کی شاہ راہ "تنازع بقا" ہے جو نہ صرف انسان اور طبیعی قوانین کے درمیان جاری ہے بلکہ خود نوع انسانی کے اندر قوموں اور افراد کے اندر بھی جاری ہے۔

(۳۴) تنازع بقا کا فطری اصول ہم پر برحیرنا فذ ہے اور ہم اسے تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں رکھتے۔

آئیے اب ذرا ان اصولوں کو پرکھ لیں۔

کیا تہذیب ارتقا کر رہی ہے | تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ عضویاتی زندگی میں فی الواقع ڈاروینی تصور کے

مطابق قانون ارتقاء کام کر رہا ہے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ انسان کی عضویاتی اور تہذیبی و اخلاقی زندگی میں ایک بہت بڑا فرق ہے جس کے ہونے ہوئے دو لوگوں کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا اور دونوں پر ایک ہی قسم کے اصولوں کا عمل درآمد تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کیجیے۔ آپ اگر زہر کھالیں اور پھر یہ چاہیں کہ آپ کا معدہ اس زہر کے کسی اثر کو آپ کے نظام جسمانی پر مرتب

نہ ہونے دے تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ کے کان کھلے ہرے ہوں اور کوئی خارجی آواز آپ کے دماغ پر اثر انداز بھی نہ ہو یا آپ کی آنکھ بند رہے اور آپ اپنے گرد و پیش کے موجودات اور ان کی حرکات کو دیکھتے جائیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اگر آپ یہ چاہیں کہ آپ اپنی قوت کو صرف تو کرتے رہیں لیکن اس کی کئی کو پورا کرنے کے لیے جسم بھوک کی شکل میں اپنا بل "نہ پیش کرے اور

آپ یہ بل دیدہ و دانستہ ادا نہ کریں تو ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ کتنی ٹھوس قانونیت ہے جس کی گرفت سے بچ بچنے کی کوئی راہ نہیں۔ یہاں خود ذریعہ کا داؤ نہیں چلتا۔ یہاں آپ فطرت کے مطالبات سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ مگر اپنی زندگی کے ایک دوسرے میدان

میں آپ کی حیثیت کچھ اور ہے۔ مثلاً آپ جاتے ہیں اور اپنے دہستے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں۔ مگر وہ مکمل خالی پڑے اور اتفاق سے مینز پر آپ کے دوست کا پارکر پڑا ہوا ہے۔ اسے اگر آپ اٹھا کر اٹنے پاؤں کوٹ جائیں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے اور اس فعل سے آپ پر کوئی بڑا اثر بظاہر مرتب نہیں ہوتا ہے۔ فرمائیے، اب آپ پورے اعتبار کے مقام پر اکھڑے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ایک دورا ہوا

آپ کے سامنے کھلا پڑا ہے اور انتخاب کا پورا حق آپ کو حاصل ہے۔ کوئی خارجی قوت آپ کو عمل کی کسی منفی یا مثبت شکل پر مجبور نہیں کرتی۔ یہاں فطرت کی غیر متغیر اور بے لچک قانونیت حتمی ہے۔ ان دو قسمی مثالوں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف مجبوری کا مقام ہے جہاں صحیح اور غلط کا تصور تو ہے مگر نیکی اور بدی کا نہیں۔ دوسری طرف مختاری کا منصب ہے جہاں نیکی اور بدی کا تصور کام کرتا ہے۔

دراصل آدمی کی زندگی مختلف مظاہر حیات کے خواص کی جامع ہے اور پھر ان خواص سے اوپر اپنے کچھ امتیازات بھی رکھتی ہے جن لوگوں نے اسے خاندان موجودات کا معمولی زود قرار دیا ہے انھوں نے اس کی اصلیت کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ آدمی کا جسم چونکہ

ماوی عناصر سے بنا ہے لہذا ایک حد تک اس پر طبیعیاتی قوانین کا سکہ بھی رواں ہے۔ پھر اس کے اندر نشوونما اور نظام تغذیہ پایا جاتا ہے لہذا اس پر عالم نباتات کے قواعد بھی نافذ عمل ہیں۔ پھر وہ نفس یعنی احساس اور قوت ارادی رکھتا ہے اس وجہ سے اس پر ان قوانین کی حکومت بھی ہے جو حیوانات کی زندگی میں کارفرما ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے علاوہ وہ ترک اختیار کی قوت اور اخلاقی

ذمہ داری کا منصب اور بدینیت کا زود دار جذبہ بھی رکھتا ہے، لہذا وہ کچھ اخلاقی قوانین بھی چاہتا ہے۔ جیسا انسان کی اسی آخری خصوصیت کو موجودہ عمرانی فلسفوں نے ساقط نظر رکھا ہے اور اسے دوسرے پہلوؤں کے نیچے چھپا دیا ہے۔ انسان اپنی اس خصوصیت میں

قطعاً مفود ہے اور اس پہلو سے جب ہم اس کے لیے زندگی کے اصول تلاش کرنا چاہیں تو خاندان حیات کے دوسرے اہل سراوی زندگیوں کا معاملہ ہماری ضرورت کو پورا نہیں کرتا ہے۔

جہاں تک طبیعیاتی قوانین کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی خارجی قوت کے بل پر بہ حیرت کائنات میں نافذ ہیں اور ان سے بغاوت کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ نباتاتی ضابطہ فطرت بھی نباتات کی مرضی سے نہیں بلکہ کسی اقتدار یا لادست کی طرف سے برسر عمل ہے۔ پھر اس کا بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حیوانات بھی گئے بند سے ضابطوں کے پابند چلے آ رہے ہیں اور ان کی ارادی حرکات اس ضابطہ کو توڑ نہیں سکتیں۔ یہ سارے قوانین ایسے ہیں جنہیں مشاہدہ اور تجربہ سے متنبط کیا جاسکتا ہے اور اسی سبب استنباط سے ہمارا علم طبیعیات علم ادویہ، علم اعضا، اور علم افلاک اپنی موجودہ شکل تک پہنچا ہے۔ مگر ہماری تہذیبی اور اخلاقی زندگی پر بہ حیرت کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہے بلکہ مصنوعی طریقوں سے کسی ضابطہ کو انسان خود اپنے اوپر نافذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلو میں تجربہ و مشاہدہ کا بس نہیں چلتا اور ہم کوئی قطعی رائے کسی معاملہ میں قائم کرنے سے قاصر ہیں۔

اگر طبیعیات، نباتات اور حیوانات کی زندگی کی طرح ہماری زندگی بھی مشیت یا فطرت یا کسی خارجی قوت کے پنجہ گیر ہو کر رہتی ہو تو تجربیت کی مدد سے ہم ایک سوال کا جواب بہت جلد نکال سکتے اور ایک سے زیادہ متضاد آراء کا حل نہ ہوتا۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ جو اختلاف آراء اور تضاد ہم انکارانہ نیت کی پیدائش کے روز اول سے چلا تھا وہ آج تک جاری ہے۔ ہر سوال کے متعدد جوابات بیک وقت انسان کے فطری ذہن میں پائے جاتے ہیں اور ہر جواب پر ایمان لانے والے افراد کا چھوٹا یا بڑا گروہ بھی موجود رہتا ہے۔

طبیعیات کے میدان میں آپ دیکھتے ہیں کہ انسان نے جوں جوں نئی دریافتیں کیں لادیم ذرائع و وسائل حیات تابود ہوتے گئے۔ نئے آلات پر نئے آلات کو میدان سے نکال دیا۔ نئی دریافتوں نے تمدن کی چمک دمک کو بر قدم پر زیادہ بڑھا دیا۔ کتنا نمایاں اور تقابلاً مگر دوسری طرف تاریخ تہذیب کا فطری پہلو ملاحظہ کیجیے تو آپ یہ ماننے کے لیے مجھڑوں گے کہ تاریخ میں ارتقا کے بجائے تکرار و اعادہ کا ثبوت پتا ہے۔ جو گناہ انسان نے ایک دفعہ سیکھا ہے وہ پھر اس کی ذمہ زندگی کا ایک متعلل باب بن گیا ہے اور کچھ نہ کچھ انسان ہمیشہ اس کے علمبردار ہے، اس طرح جو شکی ایک نو ایجاد ہوتی ہے وہ یکے بعد دیگرے انسانی نسلوں کی اجتماعی ذہنیاتوں سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس کی ضمانت اگر آپ چاہیں تو انسانی تہذیب و اخلاقی کی تاریخ آپ کی نگاہوں کے سامنے کھری پڑی ہے۔ بطور مثال نا جائز معاشی استغناء کو لیں۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی ہر شکل کو دنیا کے براہمانی اور عقلی مذہب کے علمبردار نفرت سے دیکھتے ہیں اور شاید اسے انسانی نیکی کی حیثیت دینے پر بھی کوئی تیار نہ ہو گا۔ یہ برائی انسان کے دور و حشر میں چھینا چھٹی کی شکل میں برسر عمل تھی اور اس کے پتے ہماری طاقت سے بڑھتا ہوا تھا۔ پھر جب سوسائٹی نے ادارہ حکومت کو مکمل کر دیا اور مذہب نے اخلاقیات کو مستحکم بنا دیا تو اس نے ایک ویرانہ پیدا کر لی یعنی علانیہ لوٹ مار میں جب رکاوٹیں پیدا ہو گئیں تو چوری چکاری اور نقب زنی کا فن ایجاد ہوا۔ لیکن اس فن سے استفادہ کرنا بھی ضعیف البنیہ لوگوں کے لیے مشکل تھا اور پھر سے جاننے کی شکل میں قانونی عقوبتوں اور رائے عامہ کی نغزین کی وجہ سے لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ لہذا اس فن کو اور ترقی ہوتی اور جوڑے اور سود کے طریقے ایجاد ہوئے جو قانون کی نگاہوں میں بھی دھول چھوڑ سکتے تھے۔ پھر حبشین وجود میں آئی تو سرمایہ وسیلہ کار بن گیا۔ اب تاریخ کی اس حرکت کا

کا مطالعہ کرنے والی شخص ذرائع اور وسائل کا میں تو ضرور ارتقا دیکھے گا مگر ان ذرائع و وسائل سے کام لینے والی خالمانہ خواہش بر دور میں ایک ہی پائی جائے گی، اس میں ہر موزون نہ ہوگا۔ ذرائع و وسائل کے اس ارتقا سے دھوکا کھا کر ایک سطح میں شخص ضرور یہ دعویٰ کر بیٹھے گا کہ تہذیب ارتقا کر رہی ہے مگر حقیقت تہذیب کا یہ ارتقا صرف طبعی پہلو سے ہے، اخلاقی پہلو کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ اخلاق کے اعتبار سے نوع انسانی کا ایک حصہ ہی سہی آج سے کچھ ہزار برس پہلے گرا ہوا تھا اسی میں آج بھی گرا ہوا ہے۔ آج بھی ناجائز سماجی انتفاع کی خواہش کا شیطان بدستور برسرِ کار ہے اور اس نے انسانی عقل کی مدد سے معاشی مظالم کو تہذیب پیرایہ میں جاری رکھنے کے لیے بلینگ سٹم کے نگینے جاں پھیلا دیے ہیں جن کے ٹھاٹھ دیکھ کر ایک عوامی ہی کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید یہ ادارے تہذیبی ارتقا کی ٹھوس شہادت ہیں۔ پھر سیاسی کبریائی کے عظیم نشان گناہ کو بیٹھے۔ اس کے متعلق بھی ہر شخص خواہ خدا پرست ہو یا دہریہ یا متفقہ رائے رکھتا ہے کہ کئی انسانی فرد یا گروہ کو دوسرے انسانوں کو اپنا بندہ بنا کر رکھنے کا حق نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ ہماری تہذیب برسوں کے ارتقا کے بعد بھی کیا اس شیطان کو میدانِ جیات سے خارج کر سکی ہے؟ جو اب نفی میں ہے؛ بالکل ابتدائی دور مدینیت میں اس کا معصوم آغاز قبائلی کبریائی سے ہوا۔ یعنی جو قبیلہ مضبوط اور کثیر افراد پر مشتمل ہوتا تھا وہ دوسرے قبیلوں کو خنجر کر لیتا تھا۔ پھر جب بادشاہت جمائے کے فن میں ترقی ہوئی تو تک فتح کرنا لازمہ شاہی بن گیا۔ اسکندر، نیولین، اور چنگیز و بلاکوسا سیاسی خداوندی کی سے کے منوالے تھے۔ موجودہ دور میں یہ بلا بلا سے بے درماں ہو گئی ہے اور قوموں پر قوموں کی شہنشاہت مسلط ہے۔

اس برائی کی تاریخ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھتے تو حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ایک دور جہانی قوت کا تھا اور اس دور میں بھٹا جم رکھنے والا فرد دوسرے افراد پر اقتدار جمالینا تھا۔ پھر اداروں کے استعمال کی ہمارت ذریعہ اقتدار بنی۔ پھر بتوں کی مجاوری اور عبادت گاہوں کی پرستی اور کہانت و فال گیری خدائی کا وسیلہ ٹھہری۔ پھر جائیداداری، انکسار کا ذریعہ قرار پائی۔ پھر سرمایہ داری اور ساموکاری نلو کا زینہ بنی۔ پھر دماغ کی تیز فعالیت بڑائی کی شاہ راہ بنی۔ نہ صرف یہ بلکہ حکومت کا ادارہ بھی ناخدا شناس سوسائٹیوں میں اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ جب تک شہنشاہت کا دور جاری رہا بادشاہ اور اس کے درباری اور حکومت کے کل پرزے سے سیاسی خدائی کے حصہ دار رہے۔ پھر جب دور جمہوریت کا آغاز ہوا تو اکثریت رکھنے والی پارٹیوں اور طبقوں کے کوس بنی الملک بنا کر شروع کیا۔ پھر اسی جمہوریت سے ایک جماعتی ریاست (One party state) کا تصور برآمد ہوا اور ایک جماعت نے فغانی اور مادی طاقت کے بل پر استبداد کا عالم بند کیا (اس کی مثال روس اور جرمنی کا سیاسی نظام ہے)۔ اب غور کیجیے، کیا ارتقا اس معنی میں ہوا ہے کہ ان برائی سے بھاگ کر چھائی کی طرف بڑھا ہے، یا اس معنی میں کہ برائی کی اصل روح کو برقرار رکھ کر برائی کے طریقوں کو ترقی دی گئی ہے؟

برطانیہ میں سرمایہ داروں کی جو قوت حکمراں ہے وہ اس حق کے بل پر حکمراں نہیں ہے۔ بلکہ محض عیاری کے زور سے حکمراں ہے۔ جرمنی میں نازی اقتدار کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ اس سے بہتر کوئی اقتدار ہو نہیں سکتا، اس کی بنیاد اس سخت گیری پر ہے جس سے ہودی قوم کو ایک شکنجے میں جکڑ دیا ہے۔ روس میں مزدوروں کی پارٹی ڈکٹیٹر شپ اس وجہ سے نہیں چلی ہی ہے کہ وہ نظریات کو محبوب ہے، بلکہ اس کے بقا کا راز وہ شدادانہ نظام ہے جس نے دماغوں کو، زبان و قلم کو اور عام جماعتی طاقتوں کو قاتل توہینت میں بالکل کس دیا ہے۔ آج سے آپ اندازہ کریجیے کہ ہمارے سیاسی نظام اپنی خارجی شکلوں کے لحاظ سے کتنے ہی چمکدار کیوں نہ ہوں ان کے اندر استبداد کی

دی زادھا" تاج رہی ہے جس کی چہرہ نش کی فیس "نفس" انسانی خون ہے۔ پھر یہ سب کچھ دیکھ کر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ارتقار جو رہا ہے۔ اور آگے بڑھے! تعصب کو برائے انسان برائے گا اور کہتا رہا ہے، مگر یہ بلا اول روز سے آج تک انسان کی جان کی لاگو ہے۔ پہلے تعصب شاید زیادہ تر مذہبی مسلکوں کی حد تک کام کرتا تھا، مگر اب فلسفوں کے رگڑے پے میں سرایت کر گیا ہے۔ آج کے آزاد خیالوں کو ٹھول کر دیکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں عصر رواد کے خیالات کے حق میں شدید تعصب کار فرما ہے۔ مغرب مشرق کے باشندوں کے خلاف تعصب کام لیتا ہے، سفید فام آدمی رنگین جلد والی اقوام کے خلاف تعصب رکھتا ہے، بر قوم دوسری قوم کے خلاف، ہر طبقہ دوسرے طبقہ کے خلاف، ہر سیاسی پارٹی دوسری سیاسی پارٹیوں کے خلاف شعوی یا نیم شعوری طور پر تعصب کام لیتی ہے۔ تہذیب گرا ارتقا کر رہی ہے تو ہزاروں سال کی کوششیں اپنی پیش پا افتادہ برائی کا خاتمہ کیوں نہیں کر سکیں؟

انتہا پسندی صرف ایک برائی نظر آئے گی، مگر یہ جب ایجاد ہوگی تو اب اس کا سلسلہ چل رہا ہے۔ واقعات کا ایک رخا مطالعہ برائے، گریہ انسانی ذہنیت کا عام مرض ہے۔ اسباب و عمل سے اپنے حسب خواہش نتائج اخذ کرنے کی عادت بہت مضربے، مگر آدمیت اس سے بچتا نہیں چھڑا سکی جھوٹ نہ مٹ سکا، وعدہ خلافی ابھی تک باقی ہے، شراب نوشی جیسی مسلمہ برائی بحال ہے، فریب دی جیسی اخلاقی بیماری دب کر ابھرتی ہے۔ پھر کیا اسی کا نام تہذیبی ارتقار ہے؟

اس بحث کا مدعا یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ انسان کتاب مقدس کے منشاء کے مطابق پیدا ہونے والا ہے اور اس کے پاس برائی ہی برائی ہے اور کچھ نہیں۔ نہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ نیکی اور بدی دونوں قسم کے محرکات سے متاثر ہے۔ اس میں پھر رجحانات ایسے ہیں جو اسے ذاتی خواہش کا پرتا رناتے کے لیے برسر عمل رہتے ہیں اور کچھ ایسے داعیات ہیں جو اسے دوسرے انسان کے مفاد کا لحاظ کرنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک وقت ایک فرد بھی ہے اور ایک ہیئت اجتماعیہ کا عضو بھی۔ یہ دونوں قسم کے محرکات ہر زمانہ میں برسر عمل رہتے ہیں اور ان میں تقصا دم جاری رہتا ہے اور انھیں کے زور کرنے سے کبھی تہذیب آگے کو حرکت کرتی ہے اور کبھی پیچھے۔ کو طبی اسباب و وسائل کے لحاظ سے تمدن کی تاریخ آگے بڑھی چلی جا رہی ہے، لیکن ان اسباب کام لینے میں جن مقاصد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور جن اصولوں کو اختیار کیا جاتا ہے وہ روحی اعتبار سے مختلف ادوار میں یکساں رہتے ہیں۔ یہ دو حیثیت تھی جسے تہذیبی ارتقار کے داعیوں نے نظر انداز کر دیا اور غلط مینا دوں پر علوم کی تشکیل کر ڈالی۔

حیاتیات کی مجبورانہ حرکت | ہمارے علمائے مہینات نے انسان کی ثقافتی زندگی سے جو دوسرا اصول اخذ کیا وہ یہ تھا کہ تہذیبی ارتقار کا تسلسل انسان کی شعوری خواہش کے بغیر بحال رہتا ہے کیونکہ حیاتیاتی زندگی کی طرح ہماری تہذیبی زندگی بھی طبیعی نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور یہی طبیعی نظام اپنے اصولوں کے ماتحت ہیں ایک لگے بندھے راستہ پر بے جا رہا ہے۔ یہاں پھر ایک عظیم انسان غلطی کر ڈالی کہ انسان کو عام موجودات اور خصوصاً حیوانات سے ممتاز نہ سمجھنے کی وجہ سے موجودہ فلسفہ تمدن نے یہ ٹھوکر کھانی کہ جس صورت حال کو طبی، بنیاتی، اور حیوانی دنیاؤں میں کار فرما دیکھا اسی کو انسان پر بھی چسپاں کر دیا۔ کارخانہ طبیعت پورے کا پورا ارتقا کر رہا ہے اور بغیر کسی نمایاں خواہش کے ارتقار کر رہا ہے۔ اس میں بنیات اور حیوانات سب برابر کے شریک ہیں، سب اپنے کسی ارادہ کے بغیر طبیعت کے دھکیلنے سے اصلیت کی راہ پر بڑھ رہے ہیں، اس لیے یہ فرض کیا گیا کہ انسان بھی طبیعت کے دباؤ سے ارتقار کر رہا ہے۔

دراصل اس معاملہ میں مفکرین عہد جدید کی کوتاہی یہ تھی کہ وہ شعور و اختیار کی اس سرحدی کلیہ کو نہ سمجھ سکے جسے پھانڈ کر زندگی جدا گانہ

قسم کے حالات میں داخل ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے شعور و اختیار کو بالکل وہی حیثیت دی جو شیر کے لیے بخوں کی ہے اور ہاتھی کے لیے نوٹ کی۔ ان کے لیے اس کے سوا دراصل چارہ بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ کائنات کے مطالبہ میں اول قدم پر ہی ایک ایسی غلطی کر آئے تھے جس سے غلطی و غلطی کی ایک سلسل کا پل نکلنا ناگزیر تھا۔ ان کی تحقیق کا فیصلہ یہ تھا کہ کائنات کے پس پردہ کوئی "فَعَالٌ لِّمَآئِیْرٰتِیْنَ" شعور برہم عمل ہے ہی نہیں؛ یہ جو شعور کے آثار نظر آتے ہیں یہ سب کچھ مادہ و قوت کی اندھی فطرت کا کرشمہ ہے۔ بدیں وجہ ان ان کے شعور کی اصل قیمت کا اندازہ ان کو نہ ہو سکا۔ حالانکہ مادہ و قوت کے اندر سب سے ایک منضبط پیچیدہ نظم کو ارتقاری راہ پر ہمواری سے چلانے کا تخیل بالکل احمقانہ ہے۔ اگر خدا کے نام کے خلاف ان میں انتہائی تعصب موجود ہوتا تو یہ حضرات بلا ناظر تسلیم کر لیتے کہ مادہ کی مشینری جو قوت کی اسٹیم سے چل رہی ہے، اپنے پیچھے ایک ذی شعور موجود اور ڈرائیور رکھتی ہے۔ اس کی مشینت جو اندھی نہیں بلکہ سواکھی ہے وہی بے جان عناصر کو گھسیٹ کر نباتات کی منزل پر لاتی، پھر اس منزل سے آگے بڑھ کر اس نے حیوانات کا عظیم ایشان چڑھا کر گھریا پھر وہی زندگی کو دھکیلتی ہوئی انسانیت کی منزل پر پہنچا گئی جو کائنات کے مرکزی شعور کا بہترین اور آخری پیرایہ ظہور ہے۔ یہ جو مشینت نے وجود کو شعور چلی کے مقام پر پہنچایا ہے تو اس کا مقصد یہ تھا کہ وجود کو دھکیل کر آگے چلانے کے بجائے اسے بطور خود حرکت کرنے کے قابل بنایا جائے اور اسے ارتقائی راہ پر بڑھنے کے لیے خارجی ہدایات کا حاصل ہو جانا کافی ہو۔ دوسرے نظموں میں وجود کو مشین کی سطح سے اٹھا کر نائب کارندے کی سطح پر لایا گیا۔ پہلے وجود صرف موٹر گاڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ڈرائیونگ فطرت کے ذمہ تھی، اب وجود کی ڈرائیونگ خود وجود کے شعور کی طرف منتقل ہو گئی اور فطرت کا کام یہ رہ گیا کہ وہ ڈرائیور کو اپنی سلطنت کی بیڑھی سیدھی راہوں کا پتہ دے اور ارتقائی راہ کی خارجی ہدایت کرے۔ اسی خارجی رہبری کے لیے صاحب فطرت کی طرف سے سلسلہ ایہام و نبوت کا اجراء ہوا۔ مذہب کے احکام راہ ارتقار کے دو طرفہ سرحدی نشانات اور علامات کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

شاید یہ کہا جائے گا کہ انسان جب شعور رکھتا ہے تو اس کو خارجی رہبری کی احتیاج ہی کیا ہے، خارجی ہدایت کی پابندی تو آزادی کی اس خواہش کے خلاف ہے جو شعور کے لازمہ کی حیثیت سے آدمی کی ذہنیت میں کام کر رہی ہے۔ اس کے جواب میں اوپر والی مثال ہی کافی ہے۔ اگر ایمین کا صانع اور مالک اس کے صحیح استعمال کے لیے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیتا ہے تو یہ ڈرائیور کی آزادی سلب کرنا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی سڑک کو نشانات سے محدود کر دیا جاتا ہے تو اسے مسافر کی آزادی میں مداخلت بے جا نہیں کہا جاسکتا۔ آزادی کو تقادم کی آزادی اور کھڈ میں جا کرنے کی آزادی کا ہم معنی سمجھنا محض ایک حماقت ہے۔ اگر کوئی مسافر وہ نہائی کو اپنے شعور و اختیار کی توہین چھے اور مراد کرے کہ میں اپنا راستہ خود بناؤں گا تو مختلف سمتوں پر سفر کا تجربہ کرنے اور بہترین شاہ راہ کو تلاش کرنے میں اس کی پوری عمر صرف ہو جائے گی۔ یہی حال نورع انسانی کا ہے۔ یہ مسافر صدیوں کی کوشش کے بعد بھی نہ تو اس نظام عالم کو سمجھ سکا ہے جس میں یہ سانس لے رہا ہے، نہ خود اپنے آپ کو سمجھا ہے، نہ اپنے تمدن کے بنیادی مسائل کو سمجھا ہے اور نہ مختلف تہذیبی اصولوں کی آزمائش سے فارغ ہوا ہے۔ کیونکہ ایک ایک تہذیبی اصول کی آزمائش صدیوں کی جہلت چاہتی ہے۔ شاید ہماری نوعی زندگی کی پوری جہلت گدو جاتے پر ہمارا شعور ان اسرار سے پورے طور پر واقف ہو جائے جو تمدن کی گاڑی کو ارتقاری راہ پر بڑھانے کے لیے ضروری ہیں۔

بہر حال ہمارا مدعا یہ عرض کرنا ہے کہ علمائے عمرانیات نے شعور کی ذمہ داری کو نہ سمجھا شعور کے ہونے کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ آدمی

پر خیر اور شر دونوں قسم کی شاہ راہیں کھل گئی ہیں اور وہ دونوں بے گامزنی کرنا چلا آرہا ہے۔ درنہ اگر فی الواقع ارتقا کا تسلسلہ غیر متقطع ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "شر" ہماری زندگی میں ہے ہی نہیں۔ اگر "شر" نہیں ہے تو "خیر" کا تصور بھی ناممکن ہے۔ پھر ان دونوں تصورات کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس رہ گیا جاتا ہے ادناپ شہور کا دعویٰ ہی کس بنا پر کرتے ہیں؟

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ آدنی خیر اور شر دونوں پر قادر ہے اور ان میں سے کسی ایک رو بہ کو انتخاب کرنے کی آزادی بھی رکھتا ہے، یہ حقیقت ناقابل انکار ہو جاتی ہے کہ تہذیب انسانی میں لازماً ارتقا ہی ارتقا نہیں بلکہ تنزل بھی ہے اور یہ ارتقا رجحان نہیں بلکہ ارادی ہے۔ جب کبھی انسان اپنے رویہ کو خیر کے سانچے میں ڈھالے گا تو ارتقا ہو گا اور جب اس کی زندگی کی سوئی "شر" کی سمت میں گھوم جائے گی تو تہذیبی انحطاط کا دور شروع ہو جائے گا۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی و طبقاتی، قومی اعمال ہوں یا قومی، ان سب پر یہی اصول حاوی ہے۔

یہ دو قسمیں ہیں کہ آدنی حیوانی اور انسانی، انفرادی اور اجتماعی، انتہا پسندانہ اور معتدلانہ، عقل اور جذباتی، دوہری قوتوں سے مزین ہے اور دونوں قسم کی قوتوں کو تحریک دینے والے لاتعداد محرکات زور کرتے رہتے ہیں۔ ایک نوعیت کی قوتیں بھرتی ہیں تو حیات کی حرکت اپنی نظری سمت میں جاری ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب دوسری نوعیت کے خارجی محرکات کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو دوسری نوعیت کی ذہنی قوتیں سطح پر آجاتی ہیں اور حیات کی حرکت ایک دوسری سمت میں ہونے لگتی ہے۔ زندگی کی اس دو سمتی حرکت کے ساتھ طبیعی میدان میں ارتقا جاری رہتا ہے۔ مگر ماحول کے اس گہرے اثر کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں حیرت کا فرما ہے۔ نہیں! اس ظاہری حیرت کے ساتھ ساتھ انسان کا ارادہ بھی تہذیبی اور اخلاقی اعمال کی تشکیل میں شامل رہتا ہے۔ آدنی اگر پوری طرح اپنے آپ کو ماحول کے پنجے میں دیتا ہے تو بھی اپنی قوت ارادی کی بنا پر اور اگر وہ ماحول پر غالب آنے کے لیے اپنے آپ کو بعض اصولوں کا پابند بناتا ہے تو بھی اپنے انحطاط سے یہ ارادہ دستاویز اس کی تہذیبی کارگزاریوں کی بے زوری ذمہ داری خود اس پر ڈال دیتا ہے۔

ہماری قومی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے متضاد فکری عوامل رکشی میں مصروف ہیں۔ ہر تمدنی دور میں کچھ انسان ایک قسم کے عوامل کی گرفت میں کام کرتے ہیں اور کچھ دوسری قسم کے عوامل کی انگلیوں پر تپتے ہیں۔ بعض "خیر" کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور بعض "شر" کی طرف اور عقل بلا امتیاز دونوں گروہوں کو رنگا رنگ وسائل کا فراہم کر کے دیتی رہتی ہے۔ جہاں فی گروہ زیادہ وسائل کا دار و قوت کا کردگی حاصل کر لیتا ہے وہ اونچا اٹھ جاتا ہے اور اس کی بنیاد ہوتی تہذیب، اس کی سیاست، اس کے اخلاق، اس کے علوم و فنون فضا پر قبضہ کر لیتے ہیں، گروہ دوسرے عوامل اندر اندر زور دے کرتے رہتے ہیں اور آخر کار جب انھیں انقلاب ٹھانے کا موقع مل جاتا ہے تو سلطان کے قبضہ میں جاتی ہے۔ گویا طبی ارتقا کے لباس میں خلاقیت اور تہذیبی تکرار کا عمل جاری ہے۔ دوسرے نظروں میں یوں کہنا چاہیے کہ ہماری تہذیبی حرکتیں سب سے زیادہ ایک ہی حرکت ہیں اور اس کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک انسانی شعور پر ہے۔

خطبات

عصہ سے یہ کتاب ختم تھی۔ اب دوبارہ چھپ کر ہائے کتبہ میں آگئی ہے۔ ضرورت مند حضرات کے لیے اطلاعاً عرض ہے۔ قیمت چھ پنہا، پینچ کتبہ جماعت اسلامی۔ دارالاسلام۔ پٹھانکوٹ